بسم اللہ الرحمن الرحیم

فقہ جعفری کی اساس و ہیئت اور اجتہاد

حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسین صاحب صدر الافاضل

یہ بات سب جانتے ہیں کہ اسلام میں حاکمیت کا حق صرف اللہ کو ہے اور مسلمان صرف احکامِ خدا کی اطاعت کو دینی طور پر واجب جانتا ہے، غیر اللہ کی اطاعت حرام ہی نہیں، بلکہ کہیں کفر ہے کہیں نفاق ہے، کہیں عصیان و نافرمانی ہے۔ اللہ ہی خالق و مالک اور وہی حاکم و مولیٰ ہے، سورۂ الاعراف کی آیت نمبر ۵۴ ہے۔ الا لہ الخلق والامر، تبارک اللہ رب العالمین ٥ (خلق و امر، اللہ کی خصوصیات و امتیازات ہی میں نہیں بلکہ صرف اور صرف اسی کے ساتھ مختص ہے۔ وہ رب العالمین ہے اور برکت والا ہے) حاکمیت الٰہیہ کی تفصیلات قرآن مجید میں موجود ہیں، مسلمان ان تمام تعلیمات کو تسلیم کرنے کے بعد کہتا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ۔ کوئی معبود، کسی کلی یا جزوی اطاعت کے قابل نہیں، بلکہ کوئی کسی طرح کا معبود ہے ہی نہیں، معبود و قابلِ اطاعتِ کاملہ صرف وحدہٗ لاشریک "اللہ" ہے۔ سورۂ یوسف میں دو جگہ اور سورۃ الانعام میں واضح طور پر فرمایا۔ ان الحکم الا للہ اور سورۃ انعام ہی کی آیت نمبر ۶۲ میں یہی بات دوسری تنبیہ و تاکید میں یوں آئی" الا لہ الحکم وھو اسرع الحاسبین "یاد رکھو، توجہ اور دھیان دو۔ حکم صرف اللہ ہی کا ہے اور وہ بہت جلد اور بہت تیزی سے حساب لینے والا ہے۔

اللہ نے اپنی حاکمیت کے قیام و دوام کے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا، اور قرآن مجید نازل کیا، اس لیے نہیں کہ وحی لوگوں کو سنا کر اور پیغامِ الٰہی پہنچا کر چلے آئیں، آپ کا فرضِ منصبی آیات سنانا، ضمیر و نفسیاتِ انسانی کو پاک بنانا، قرآن مجید کی تعلیم دینا اور حکمت سے آشنا کرانا تھا۔

لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلوا علیھم اٰیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔ (۱۶۴)

ترجمہ: یقیناً، اللہ نے مومنوں پر احسان کیا، کہ ان میں ایک رسولؐ خود ان میں سے بھیجا، وہ ان کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت فرماتا، انہیں پاکیزہ بناتا اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ وہ لوگ پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

محمد رسول اللہ ــــ کا مطلب ــــ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فقط پیغام رساں ہونا نہیں بلکہ وہ اللہ کے آخری نمایندۂ خاص اور حکومتِ الٰہیہ کے سربراہ ہیں

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ۔ (آیت ۱۰۵)

ترجمہ: ہم نے تم پر کتاب برحق نازل کی تاکہ تم لوگوں میں فیصلہ کرو، جو اللہ نے تمہیں دکھایا، اس کی روشنی میں۔

امورِ حکومت بلکہ ہر معاملے میں آپ کی بات کو اپنی بات قرار دے کر نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارک کو تمام بندوں سے بلند ترین، اور تقربِ خاص کی عظیم ترین منزل پر سرفراز فرمایا:

وما ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحی یوحٰی۔ (النجم: ۳)

بھی وہ خواہش سے تو بات کرتا ہی نہیں اس کی بات تو فقط وہی وحی ہے جو اسے خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔

ہم سب کے بارے میں سورۃ النساء میں ایک کلیہ بتایا:

فلا وربك لا يؤمنون حتّٰى يحكموك فيما شجر بينهم ثمّ لا يجدوا فى انفسهم حرجًا ممّا قضيت ويسلّموا تسليمًا۔ (۶۵)

ترجمہ: تو، قسم ہے تیرے رب کی، جب تک وہ اپنے باہمی اختلافات میں تجھے اپنا حَکَم نہ مان لیں اور تیرے کئے ہوئے فیصلے پر تنگی دل محسوس نہ کریں اور کما حقہٗ اسے تسلیم نہ کریں اس وقت تک وہ مومن ہی نہیں ہو سکتے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ:

وما ارسلنا من رسولٍ الا ليطاع باذن الله۔ (النساء آیت ۶۴)

ترجمہ: اور ہم نے کسی رسول کو بھیجا ہی نہیں مگر اس لئے کہ حکمِ خدا سے اس کی فرمانبرداری کی جائے۔

ومن يطع الرّسول فقد اطاع الله۔

ترجمہ: اور (اس) رسول کی جو بھی اطاعت کرتا ہے وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔

پھر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تو اپنی آخری کتاب، اپنے کامل و اکمل دین اور اپنی حاکمیتِ مطلقہ کو نافذ و غالب بنانے کے لئے بھیجا۔

هو الّذى ارسل رسوله بالهدٰى ودين الحق ليظهره على الدين كلّه ولو كره المشركون۔ (الصف - ۹)

ترجمہ: وہی ہے، جس نے اپنے اس رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ وہ

تمام ادیان پر اسے غلبہ دے، خواہ مشرک اس بات کو ناپسند ہی کیوں نہ کریں۔

اور حکمِ عام دیا:

ان کنتم تحبّون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ (آل عمران: ۳۱)

ترجمہ: اگر تم لوگ اللہ سے محبت کرتے ہو، تو میری (محمدؐ) کی اطاعت کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

وما اٰتاکم الرّسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا۔ (الحشر: ۷)

ترجمہ: اور رسولؐ جو بھی تمہیں دیں وہ قبول کرو اور جس سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔

اس کے بعد ہر فیصلے میں حکمِ خدا کے خلاف اور قرآنِ حکیم سے روگرداں رائے دینا، کفر و ظلم ہے، مسلمان کا طریقہ گردن جھکانا اور فرمانِ خدا بجالانا ہے۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکٰفرون۔ (المائدہ ۴۴)

ترجمہ: اور جس نے بھی اللہ کے نازل کردہ احکام کے خلاف فیصلہ کیا، وہ کافر لوگ ہیں۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الظٰلمون۔ (المائدہ: ۴۴)

ترجمہ: اللہ کے نازل کردہ (احکام) کے خلاف فیصلہ جس نے بھی کیا۔ وہ ظالم لوگ ہیں۔

اور اسی سلسلے کی یہ آیت بھی اصول و آئین کی حیثیت رکھتی ہے:

لا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسّکم النار وما لکم من دون اللہ من اولیآء ثمّ لا تنصرون۔ (ھود ۱۱۳)

ترجمہ: جن لوگوں نے ظلم کیا، ان کی طرف نہ جھکو، پھر تم کو آتشِ جہنم پکڑ لے گی اور اللہ کے علاوہ تمہارے مددگار ہیں بھی نہیں۔

ان آیات سے کم از کم یہ بات ضرور معلوم ہوئی کہ غیر اسلامی افکار و فلسفہ اور قانون کی طرف جھکاؤ، اور غیر اللہ کے بنائے ہوئے قانون کی طرف استناد مسلمان

کا شیوہ نہیں۔ جب اُسے جامع اور کامل نظامِ حکمرانی مل چکا، جب اسے ہمہ جہانی فلسفۂ فکر و عمل دے دیا گیا، جب اس کے پاس بے عیب و خلل قانون موجود ہے، تو پھر غیر اللہ کی طرف جھکنا کیسا؟ اور غیر از رسول آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کسی کی بات ماننے کے لیے جواز کیا ہے؟ بلا شبہ انسان اور معاشرہ، ضروریات اور افکار کا پھیلاؤ دن بہ دن بڑھتا ہے احتیاجات بشر روز افزوں ہیں۔ لیکن اسلام ان پر بند بھی تو نہیں باندھتا۔ اس نے ترقی سے کب روکا ہے وہ تو اَنفُس کو آفاق کی وسعتوں کا حامل جانتا اور ہر آن مطالعہ و مشاہدہ کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن دُنیا کے کسی دانشور نے، دُنیا کے کسی نظام نے، دُنیا کے کسی منکرِ ربوبیت فلسفے نے بھی یہ نہیں کہا کہ آدم زاد شترِ بے مہار ہے۔ جن لوگوں کی نظر مادی فلسفے پر مبنی نظامہائے زندگی و حکومت پر ہے وہ جانتے ہیں کہ اس نظام میں انسان کو لب کھولنے، اپنے دائرے سے باہر قدم نکالنے کا بھی حق حاصل نہیں۔

اسلام تا قیامت رہنے والا دین ہے، اس میں ہر تبدیلی کا خیر مقدم، ہر علمی اور سائنسی عمل کا جواز اور ہر قسم کی معلومات حاصل کرنے کی ہمت افزائی ہے۔ پذیرائی اجازت اور تشویق کے ساتھ، اصولوں کی نگہداشت اور قوانین کی پابندی نہ ہوتی تو نظام و فلسفہ باطل ہو جاتا، دستور و قانون کی عمل داری برقرار رکھنے عجلت پسندی، لذّت دوستی، اپنی بھلائی چاہنے اور دوسروں کے حقوق چھین لینے کی ہوس پر کڑی نظر رکھنے ہر شخص کے آقا بننے اور دوسروں کو غلام بنانے کی روک تھام کے لیے نظام عدل کو جاری رکھنے اور اللہ کی حکومت برقرار رکھنے کے لیے ـــ تفقہ فی الدین، ـــ دین فہمی ـــ اور ـــ اجتہاد کی اجازت دی۔ اور ماحول و ضروریات کی تبدیلی کے وقت صحیح فیصلہ کرنے اور نئے افتاد پر ہر چیلنج قبول کرنے بلکہ خود چیلنج کرنے کو ایک انجمن، ایک ٹیم، ایک گروہ اور ایک جماعت ماہرین کو ہمہ وقت تعلیم و تعلّم کا پابند کیا۔ فہم دین اور دین شناسی کا عمل ایک لمحے کے لیے معطل نہیں ہو سکتا، پھر دین شناسی ایک ذات یا چند افراد کا نجی عمل نہیں بلکہ اس کی ذمہ داری اس علم کے ابلاغ، حکم کی ترویج اور قانون کا نفاذ

اجتماعی ذمہ داری ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۱۲۲ ہے۔

وما کان المؤمنون لینفروا کافۃ، فلولا نفر من کلّ فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقّھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون۔

ترجمہ: مومنوں کے لیے یہ مناسب نہیں کہ سب کے سب جہاد کے لیے نکل پڑیں، ایسا کیوں نہ ہو کہ ہر گروہ میں سے ایک جماعت جہاد کے لیے جائے اور (بقیہ لوگ اس لیے رہ جائیں کہ) دین کے معلومات (دین شناسی) حاصل کریں اور جب (جانے والے) واپس آئیں ان کے پاس تو یہ اپنی قوم کو (محرمات اور برے کاموں سے) ڈرائیں تاکہ وہ بچتے (اور احتیاط کرتے) رہیں۔

جنگ جیسی ہنگامی حالت میں "تفقہ فی الدین" کی خاطر کچھ لوگوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں رہنا اور دین کو سمجھنا۔ پھر فوج کی واپسی پر انہیں امر و نہی، تعلیم و تنبیہ، سیاستِ ریاست کے معاملات اور قابل احتیاط امور سے متنبہ کرنا، اس آیت کا حکم ہے، اس سے اجتہاد کا رجحان اور مجتہد کا منصب معلوم ہوتا ہے، چونکہ ہادی امت، رسول اعظم، نبی خاتم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک دن رفیق اعلیٰ کے پاس جانا تھا اس لیے اپنے تعلیمات کی علمی اور عملی توضیح و تشریح کے لیے، شریعت کو تحریف و تخریب سے بچانے کے لیے ایک ذمہ دار فرد، ایک تربیت یافتہ شخص یعنی اپنا خصوصی ترجمان، اپنی فکر و روح کا متبادل امت کی نگرانی کے لیے چھوڑنا چاہیے تھا۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "فاطمۃ بضعۃ منی۔" یا علی انت منّی وانا منک۔ اور امام حسنؑ کے لیے فرمایا: ھٰذا منّی ـــ امام حسینؑ کے لیے ہے "حسین منّی وانا من الحسین۔" لہٰذا ہم ان حضرات

کو نمایندۂ سُنّت جانتے اور عین سنّت مانتے ہیں۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ اسلامی قانون مستمر و جاری ہے، کائناتی تغیرات اور معاشرتی عروج و زوال سے پیدا ہونے والے مسائل کے لیے قانون کے قطعی اصول موجود ہیں جن کی بنیاد پر حلِ مسائل ہر لمحے کی ضرورت ہے، لہٰذا اجتہاد زندہ اور اس کا عمل مسلسل ہے، اس عمل کے بنیادی مآخذ اور ان سے استنتاج کی نوعیت کا تعارف یہ ہے:

ماخذ، تعارف و حدود

کتاب: قرآن مجید، بلاشک و شبہ احکامِ خدا کا پہلا سرچشمہ اور اولین مآخذ اور کتابِ خدا ہے علماء کے اندازے میں تقریباً چھ سو آیتیں احکام پر مشتمل ہیں، فقہاء نے ان آیتوں کی تفسیر فقہی لکھی ہے، مشہور کتابوں میں، قطب الدین، ابوالحسن، سعید بن ہبۃ اللہ راوندی (م ۵۷۳ھ) کی "فقہ القرآن" اور فاضل مقداد سیوری کی کنز العرفان اور مقدس اردبیلی ملا احمد بن محمد (متوفی ۹۹۳) کی "آیات الاحکام" قابلِ توجہ ہیں۔ تمام فقہا استنباطِ احکام اور دلائلِ فتویٰ میں قرآن کو سب سے پہلے دیکھتے اور اس سے رجوع کرتے ہیں۔

سنّت: گفتار و کردار، عمل و تائیدِ معصوم — یعنی اگر یہ ثابت ہو جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی حکم دیا، یا کوئی عمل معین انداز سے کیا یا لوگوں نے کوئی کام انجام دیا اور حضورؐ نے اس پر روکا ٹوکا نہیں بلکہ بظاہر اس پر راضی رہے، تو یہ بات ہر مسلمان کے لیے حجت اور حکمِ قطعی کی حیثیت رکھتی ہے۔

سنّت کے تین مراحل ہیں:۔

(الف) قول و فعل و تقریر (تصدیق و تائید) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(ب) نقلِ قول و فعل و تقریر رسولؐ اللہ از معصومہ ائمۂ اہل بیت علیہم السلام۔

(ج) قول و فعل و تقریرِ معصومینؑ۔

پہلی صورت، بلا اختلاف سند ہے، قرآن مجید کے واضح حکم اور احادیث و عملِ صحابہ و

اہل بیتؑ اس پر دلیل ہے۔

دوسری صورت بھی عموماً تسلیم کی گئی ہے۔

تیسری صورت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت فاطمہ زہراؑ نیز ائمہ اثنا عشر علیہم السلام کی حدیث؛ تو قرآن و حدیثِ نبی خاتم صلی اللہ علیہ السلام سے ان کا واجب الاتباع ہونا ثابت ہے۔

یا ایھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔۔۔ (النساء: ۵۹)

ترجمہ: ایمان لانے والو، اللہ کی اطاعت کرو اور اطاعت کرو رسولؐ اور اولی الامر کی جو تم میں سے ہیں۔۔۔۔۔

آیت میں چونکہ اولی الامر کی اطاعت کا حکم ضمنِ اطاعت رسولؐ میں موجود ہے۔ شیعوں کے نزدیک اولی الامر معصوم اور منصوص من اللہ ہونا اب ان حیثیت سے یہ لوگ ثانیِ رسولؐ، ترجمانِ نبی اور واضح طور پر واجب الاتباع ہیں، مزید تشریح اس حدیث سے ہوتی ہے، جسے حضرت زید بن ارقم نے آنحضرتؐ سے بایں الفاظ روایت کی ہے۔

انی ترکت فیکم ما ان تمسکتم بہ لن تضلوا بعدی، کتاب اللہ حبل ممدود من السماء الی الارض و عترتی اھل بیتی، ولن یفترقا حتی یردا علی الحوض فانظروا کیف تخلفونی فیھما۔

ترجمہ: میں نے تم میں چھوڑی وہ چیز کہ اگر تم اس سے وابستہ رہے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہوگے، اللہ کی کتاب آسمان سے زمین کی طرف ایک لمبی رسّی ہے اور میری عترت میرے اہل بیت اور یہ دونوں ہرگز جدا نہ ہوں گے حتیٰ کہ دونوں میرے پاس حوضِ کوثر

پر آئیں گے۔ دیکھو! ان دونوں کے ساتھ میرے بعد تم کیسا سلوک کرتے ہو۔

جناب زید بن ثابت کی روایت ان لفظوں میں ہے۔

"اِنّی تارك فیكم خلیفتین۔" اور بالفاظِ روایتِ ابی سعید الخدری آنحضرت نے فرمایا "انی تارك فیكم الثقلین" متعدد آیات و احادیث کی طرح ان دونوں سندوں سے درج ذیل نتیجے نکلتے ہیں:

الف۔ آئمہ اہل بیت کی عصمت، کیونکہ وہ قرآن مجید کے ساتھی ہیں اور دونوں میں جدائی ممکن نہیں۔

ب۔ قرآن کی طرح ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے تمسک واجب ہے۔ ان کی بات سچی اور ان کا کام قرآن کا ترجمان ہے، ان کے تعلیمات پر عمل فرض ہے، لہٰذا ان کے الفاظ یا قرآن سے مربوط ہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے۔ خود ائمہ علیہم السلام نے بھی یہی فرمایا ہے:

"امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: میری حدیث میرے والد کی حدیث ہے اور میرے والد کی حدیث میرے جدِ بزرگوار کی حدیث، ان کی حدیث امام حسینؑ کی حدیث، امام حسینؑ کی حدیث امیرالمومنینؑ کی حدیث اور انکی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے اور حضورؐ کی حدیث خداوند عالم کی بات ہے۔"

(الاصول الکافی جلد ا باب روایۃ الکتب)

سنّت، مسلسل سند اور راویوں کے ذریعے ہم تک پہنچی اور ہم احکام میں بے چوں وچرا ان روایتوں پر مکمل اعتماد کرتے ہیں جو قطعی اور متواتر ہوں۔ ظنّی خبر یعنی "خبرِ واحد" حجت ہے یا نہیں؟ خبر واحد سے حکمِ خدا اور رسولؐ ثابت ہو سکتا ہے یا نہیں؟

یہ ایک بحث طلب بات ہے، ہمارے علماء کا طریق کار یہ ہے کہ وہ حدیثِ صحیح و مؤثق پر بھروسہ کرتے ہیں۔ حدیث کے بہت سے مجموعے مآخذ و مصدر کے طور پر موجود ہیں۔ ہر روایت راوی کی انفرادی صفات اور متن کی ساخت کے لحاظ سے چھانی پھٹکی اور کسوٹی پر کسی جاتی ہے۔ فقیہ کے لئے ضروری و لازم ہے کہ وہ فنِ درایت و علم رجال سے کما حقہ واقف ہو، اور حدیث پر عبور رکھتا ہو۔

فہم قرآن کی طرح فہم حدیث بھی انتہائی نازک و دشوار ہے، فہم قرآن مجید کے لئے لغت و معانی و بیان، صرف و نحو جیسے مقدماتی علوم سے گذرنا پڑتا ہے اس کے بعد چند دوسرے مقدمات کا اضافہ مطالعۂ حدیث کے لئے ناگزیر ہے۔ درایت و روایت، رجال و سند پر نظر کے بعد۔ الکافی، من لا یحضرہ الفقیہ، تہذیب الاحکام، الاستبصار فیما اختلف من الاخبار۔ اور وسائل الشیعہ الی تحصیل مسائل الشریعہ" مصادرِ مہمہ کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ حدیث کے مجموعے اور سنّت کے جوامع فقیہہ مانے گئے ہیں۔ لیکن مجتہد انہیں پر اکتفا نہیں کرتا۔ وہ ہر وقت حدیث کی تلاش اور ان پر بحث و نظر کرتا رہتا ہے، موضوع، مسائل اور دلائل کی جستجو اس کا منصب ہے۔

اجماع: قرآن و سنّت کے بعد فتوے کا تیسرا ماخذ اور اصول فقہ میں تیسری دلیل شرعی اجماع ہے۔ چونکہ حقِ تشریع صرف اللہ کو ہے، تشریح و تعیینِ احکام رسول کا کام ہے، اس لئے ایک شخص کوئی ذاتی فیصلہ کرے یا قوم مل کر اتفاق رائے کرلے۔ دونوں طرح حلالِ خدا حرام اور حرامِ خدا حلال نہیں ہو سکتے، اور کسی طرح قانون خدا پر بالادستی حاصل نہیں کی جا سکتی، قرآن و سنّت کے مقابلے میں حکم کا سوال ہی نہیں، البتہ جہاں ہمیں حکمِ مسئلہ کتاب و سنّت سے نہ ملے وہاں کلیاتِ کتاب و سنّت دستگیری کرتے

ہیں، اس زاویے سے کتاب وسنّت سے سند نہ ملے تو" علماء اسلام کا ایسا اتفاق جس سے شارع اسلام کی تائید کا انکشاف ہوتا ہو"، علماء اعلام کا ایسا اتفاق ممکن ہی اس وقت ہوگا جب نبی یا امام کا اشارہ ہو اور اگر ایسا نہ ہو تو اجماع بے سود، ہمارے فقہاء و اصولیین نے اس کے وقوع و عدم وقوع، امکان و عدم امکان اور اقسام پر طویل اور نتیجہ خیز بحث کی ہے، اساس قبول استناد الی المعصوم ہی ہے، اور

الف : اجماع علماء وہی حجت ہے جو پیغمبر یا امام کے زمانے میں ہوا ہو۔ اگر ہمارے زمانے میں کسی مسئلہ پر اجماع ہو جائے تو بعد والوں کے لئے حجّت نہیں ہوگا۔

ب : اجماع بحیثیت اتفاقِ آراء علماء حجت نہیں، اس کی حجّیت کاشفِ قولِ نبی و امام کی بنیاد پر ہے۔

عقل : فقہی مسائل کو حل کرنے اور حکم خدا اور رسول معلوم کرنے کا چوتھا ذریعہ عقل ہے۔ لیکن عقلِ سادہ کار، عقلِ ہوس پیشہ اور عقلِ عام و عوام کے بجائے عقلِ تربیت یافتہ، عقلِ پختہ کارِ علوم قرآن و حدیث، وہ عقل جو قرآن و سنّت میں زیر نظر ہے وہ عقل جس کی تعریف خدا اور رسول نے کی ہے، جسے نزاکتوں کا احساس اور بندگی کا ادراک تام ہو جو حسن و قبحِ اشیاء میں مسلکِ معصومین کو مانتی اور جبر و اختیار میں راہِ حق پر چلتی ہو، جو کتاب و سنّت کے زیر اثر رہ کر خود انہی دو سندوں سے کلیات و اصول مانگ کر جزئیات کی تطبیق کرے اسی پس منظر میں" دلیل عقلی" کی تعریف یہ ہے: (بالفاظ محمد تقی الحکیم)

"حکم عقلی یتوصل بہ الی الحکم الشرعی وینتقل من العلم بالحکم الی العلم بالحکم الشرعی"

(الاصول العامہ للفقہ المقارن ص ۲۸۰)

اور ڈاکٹر رشدی کے الفاظ میں :

" والدلیل العقلی ھو عبارۃ عن کل حکم للعقل یوجب القطع بالحکم الشرعی او کل حکم عقلی یتوصل بصحیح النظر فیہ الی حکمٍ شرعی "

(العقل عند الشیعۃ الامامیہ ص ۳۳۴)

بالفاظ : شہید مرتضیٰ مطہری :

" اگر در موردی عقل یک حکم قطعی داشت، آن حکم بہ حکم این کہ قطعی و یقینی است حجت است " (آشنائی با علوم اسلامی، اصول فقہ ، فقہ ص ۱۶)

یعنی : وہ حکمِ عقل جس سے حکم شرع کے بارے میں قطع و یقین کا مل حاصل ہو۔ یا ہر وہ حکم عقلی جو صحیح بحث و نظر کے ذریعے حکم شرعی و علمِ حکم شرعی تک پہنچائے حجت ہے ظاہر ہے کہ عقل معطل نہیں ہے، اصولِ دین عقل سے مانے جاتے ہیں اور فہمِ معانیِ کتاب و سنّت عقل پر موقوف ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ فقہ میں عقل کو دخل دینے سے روکا جائے۔ جس طرح ہر علم و فن میں اختیاراتِ عقل محدود ہیں، اسی طرح فقہ میں استدلال و برہانِ عقلی سے یہ معلوم کرتے ہیں کہ فلاں مقام پر حکمِ وجوب ہے یا حکم تحریم۔ یا فلاں حکم کیونکر ہے اور کیونکر نہیں ہے ۔

علمِ اصول فقہ میں عقل سے مربوط اصول دو حصوں میں بانٹے گئے ہیں :

۱۔ فلسفۂ احکام، یعنی " ملاکات و مناطاتِ احکام "

۲۔ لوازمِ احکام : یعنی ایک حکم اور کچھ عمل اصل حکم کی تعمیل سے پہلے یا بعد انجام دینے کا عقل مطالبہ کرتی ہے۔

۱۔ چونکہ شیعوں کے نزدیک احکامِ شرعی تابعِ سلسلۂ مصالح و مفاسد ہیں اور واقع میں ہر حکمِ شرعی ایک لازم الاستیفا مصلحت پر مبنی ہے۔ اور ہر نہیِ شرعی ایک مفسدۂ لازم الاحتراز کی خبر دیتی ہے۔ انسانی سعادت کے لئے اللہ نے حقیقی مصلحتوں کا ایک سلسلہ واجب یا مستحب قرار دیا۔ اور ایک سلسلہ مفاسد سے دُور رکھنے کے لئے حرام و مکروہ قرار دیا ہے۔ اگر وہ مصالح و مفاسد حقیقی نہ ہوتے تو امر و نہی بھی نہ ہوتی، امر و نہی کی اصل حکمت اگر انسان کو معلوم ہو جائے تو ہر عاقل شخص اس کے بارے میں وہی حکم دے جو شریعت میں دیا گیا ہے۔

علما۔ کلام و اصول دونوں کہتے ہیں، چونکہ احکامِ شرعی حکمت و مصلحت و مفسدہ کے تابع ہیں، خواہ ان کا تعلق جسم سے ہو جان سے، فرد سے ہو یا معاشرے سے، حیاتِ باقی سے ہو یا زندگیِ فانی سے، لہٰذا جہاں وہ حکمت ہو گی وہاں اُسی کی بنیاد پر حکم بھی ہو گا، جہاں وہ حکمتیں نہ ہوں گی وہاں احکامِ شرعی بھی نہ ہوں گے۔

فرض کیجئے کہ ایک مورد ایسا ہے جہاں نقلی (کتاب و سنّت کی) دلیل موجود نہیں اور حکم شرعی معلوم کرنا ہے، اس موقع پر عقل سے رجوع کریں گے عقل جب مصالح مفاسد اور مورد (مسئلہ و پیش آمد) میں ایک حکمت دریافت کر لیتی ہے، تو ہم ایک دلیل عقلی قائم کریں گے۔

ا ۔ : فلاں مسئلہ میں فلاں لازم الاستیفا مصلحت موجود ہے۔ (صغریٰ)

ب : جہاں مصلحتِ لازم الاستیفا موجود ہوتی ہے، شارع وہاں خاموش نہیں رہتا اور اسے حاصل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ (کبریٰ)

ج : لہٰذا مسئلہ زیرِ نظر میں امر موجود ہے۔ (نتیجہ)

مثلاً، شارع کے زمانے میں افیون کی عادت نہ تھی اس کا استعمال معلوم نہ ہوا تھا، ہمارے پاس ادلۂ نقلیہ موجود نہیں ہیں۔ لیکن مشاہدہ سے عقلی و تجربیاتی طور پر اس کے مفاسد معلوم ہو چکے ہیں دوسرے لفظوں میں ہمارے علم و عقل نے ایک "ملاک" یعنی مفسدۂ لازم الاحتراز دریافت کر لیا ہے۔ یعنی انسان کے لئے جو شے مضر اور مفسدہ ہو شرعی طور پر وہ حرام ہے۔ لہٰذا مجتہد افیون نوشی کو حرام قرار دے گا۔

اگر سگریٹ کے لئے ثابت ہو جائے کہ سرطان پیدا کرتی ہے تو مجتہد حکمِ عقل کی بناء پر سگریٹ کی حرمت کا فتویٰ دے سکتا ہے۔ لیکن یہ حکم اس کا ذاتی حکم نہیں ہوگا۔ بلکہ حکمِ شارع ہوگا۔

شرط یہی ہے کہ عقل مصلحتِ لازم الاستیفا یا مفسدۂ لازم الاحتراز قطعی و یقینی طور پر معلوم کرے۔ اور "ملاک" و "مناط" میں شک و شبہ محسوس نہ کرے۔ اگر ظن و تخمین، ظن و خیال ہو تو وہ مقامِ قیاس ہے محلِ حکم عقل نہیں اور شیعہ ایسے مسئلہ میں ایسی دلیل کو دلیل نہیں مانتے۔

جس طرح مناطِ حکم و مصلحت معلوم کر کے حکم دریافت کیا جاتا ہے اسی طرح حکم دیکھ کر مصلحت کا یقین کیا جاتا ہے۔ اور عقل حکم کرتی ہے کہ اگر حکمت نہ ہوتی تو فلاں چیز حرام اور فلاں عمل واجب نہ ہوتا۔ حکمِ شرعی مصلحت یا مفسدہ کا انکشاف کرتا ہے خواہ اس کی تہہ کو نہ پہنچ سکیں۔

۲۔ استعمالِ دلیلِ عقلی کے مسائل و احکام کا دوسرا حصہ "لوازم احکام" ہے، یعنی حاکمِ عاقل جو حکم دیتا ہے اس کی بجا آوری کے لئے لوازم کا مہیا کرنا عقلی طور پر واجب ہے۔ حج واجب کیا گیا، شارع نے اس سلسلے میں پاسپورٹ، ویزے، ٹکٹ، راستے، ٹیکے، کرنسی کی تبدیلی کے لئے الگ الگ حکم نہیں دیئے۔ مگر شارع کی اطاعت

تسلیم کرنے والی عقل بطور قطع حکم دیتی ہے کہ مندرجہ بالا لوازم و مقدمات کا حکم بھی پہلے حکم کے ضمن میں ہوگا، یہ کام بھی عقل کا ہے کہ اصل حکم کے لوازم کا تعین کرے کہ فلاں چیز لوازم میں ہے، یا نہیں؟ واجب میں لوازم کا حکم کیا ہے؟ حرام میں لوازم و مقدمات کا حکم کیا ہے؟ مقدمہ واجب، واجب اور مقدمہ حرام، حرام ہے یا نہیں؟

ایک اور مسئلہ دیکھئے: انسان بیک وقت دو متضاد کام نہیں کر سکتا، مثلاً نماز صبح اور تطہیرِ مسجد۔ نماز بھی واجب اور معلوم شدہ نجس مسجد کی تطہیر بھی واجب اور وقت اتنا ہے کہ ایک کام ہی کر سکتا ہے بلکہ ایک کام مستلزمِ ترکِ دیگر ہے، لہٰذا، عقل فیصلہ کرے گی کہ امرِ شیٔ مستلزمِ نہی ضد ہے یا نہیں؟ اور ایک کا حکم اضداد کے لئے نہی کا حکم چاہتا ہے یا نہیں؟

تیسرا مورد: دو واجب بجالانا ہیں، اور دونوں ایک وقت میں ادا نہیں ہو سکتے تاہم مجبور ہیں کہ دو میں سے ایک بجالائیں، اس صورت میں اگر ایک اہم ہے اور دوسرا واجب اہم تر، تو کس کا انتخاب اور کس پر عمل کیا جائے؟ اور اہم تر سے تکلیف متعلق ہونے کی صورت میں اہم کی تکلیف ساقط ہو جائے گی؟ یا سقوطِ تکلیف بہ اہم اس وقت ہے جب اہم تر کو بجالانے میں مصروف ہو جائیں؟ اس بحثِ عقلی سے ایک اور اساسی مسئلہ وابستہ ہے کہ اگر ہم دونوں واجب بجا نہ لائے تو دو گناہ ہوئے یا ایک گناہ کیا مثلاً دو شخص ڈوب رہے ہیں، ہم دونوں کو نہیں بچا سکتے، ایک کا بچانا ممکن ہے۔ ایک متقی خدا ترس ہے، دوسرا فاسق و موذی، دونوں کی جان محترم ہے۔ اب مومن و متقی اور خدمت گذارِ خلق کو بچائیں کہ اس سے پاس پڑوسیوں کو فائدے پہنچتے ہیں، یا دوسرے کو؟ ایک اہم اور دوسرا اہم تر ہے۔

اگر غفلت برتی اور دونوں ڈوب گئے تو دو خون کیے یا ایک مومن کی جان ضائع ہونے کا جرم لکھا جائے گا اور دوسرے شخص کی ہلاکت میں مقصر نہ قرار پائیں گے؟

چوتھا مسئلہ: ایک کام دو مختلف زاویوں سے واجب بھی ہو سکتا ہے اور حرام بھی، یا نہیں؟ جب کہ ایک عمل ایک جہت اور ایک زاویے سے حرام و واجب نہیں ہو سکتا، مسلم ہے۔ مثلاً: مالِ غیر میں بغیر اجازت تصرف اس حیثیت سے کہ مالِ غیر ہے حرام واجب دونوں ہو، ممکن نہیں۔ لیکن ایک صورت اور بھی ہے، جیسے نماز پڑھنا واجب ہے لیکن یہ نماز غیر آدمی کی زمین پر بغیر اجازت، تصرفِ مالِ غیر کی حیثیت سے حرام ہے یا نہیں؟ ابھی یہ بات زیر بحث نہیں کہ شارع نے جائے نماز کے مباح ہونے کی شرط لگائی۔ زاویۂ بحث نماز اور تصرف در مالِ غیر ہی ہے۔

ان چاروں مسائل میں فقہاء نے بڑی دقیق بحث کی ہے اور ان کے لیے جو عقلی کلیات و مباحث ہیں ان کا مختصر حوالہ یہ ہے۔ مسئلہ اوّل کا تعلق "مقدمہ واجب" سے ہے۔ دوسرے مسئلہ کا تعلق ہے کلیۂ "امر شی مقتضی نہی عن أضدہ۔" سے ہے تیسرا مسئلہ بحث "ترتب" کے ذیل میں آتا ہے اور چوتھا مسئلہ "اجتماع امر و نہی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا پوری بحث "اصولِ استنباط" کہلاتی ہے اور فقیہ کی مہارت اور قوتِ اجتہاد یہاں معلوم ہوتی۔ یاد رہے کہ اصولِ استنباط مجموعی طور پر دو طرح کے ہیں۔

نقل: کتاب و سنت و اجماع اور عقل جس میں صرف عقلی کلیات و مباحث داخل ہیں۔

استنباطِ حکم کی دوسری شاخ اصولِ عملیہ ہیں۔

فقیہ استنباطِ حکم شرعی میں ادلّہ اربعہ سے رجوع کر کے اکثر و بیشتر تکلیف شرعی معلوم کر لیتا ہے، لیکن کبھی حکم خدا معلوم کرنے میں ناکام بھی رہتا ہے۔ آخری صورت میں اسے کیا کرنا چاہیے؟ آیا شارع اور عقل یا دونوں نے اس کی تکلیف حقیقت و واقعہ میں متعین کی ہے یا نہیں؟ اگر

تکلیف متعین کی ہے تو وہ کیا ہے؟

شریعتِ اسلامیہ کے کامل و مکمل اور ابد تک رہنے کا ثبوت یہ ہے کہ شارع نے ایسے قواعد و ضوابط متعین کئے جو ہر مرحلے میں رہنمائی کرتے ہیں اور جواب دیتے ہیں کہ ہاں، فریضہ معیّن ہے۔ کچھ ایسے مواقع ہیں جہاں عقل بھی حکم شرع کی تائید کرتی ہے، یعنی مستقل حکمِ عقل عین حکمِ شرع ہوتا ہے اور کہیں عقل خود ساکت اور تابع شرع ہوتی ہے۔ وہ قواعد و ضوابط و دستور جو مذکورۂ بالا مقامات پر رہنما اصول کا کام دیتے ہیں، چار ہیں:

۱۔ **اصلِ برأتِ ذمّہ**: یعنی اصولاً ہمارا ذمّہ آزاد ہے اور ہم پر کوئی فرض عائد نہیں ہے۔

۲۔ **اصلِ احتیاط**: یعنی اصولاً ہم وہ عمل کریں جو حکم واقعی و نفس الامری کے مطابق انجام پائے۔

۳۔ **اصلِ تخییر**: یعنی اصولاً مکلف دو تکلیفوں کے وقت کسی ایک کو اختیار کرنے میں آزاد ہے۔

۴۔ **اصلِ استصحاب**: یعنی اصل یہ ہے کہ جو پہلے تھا وہی حالت باقی ہے اور اس کے خلاف کوئی حالت طاری نہیں ہوئی۔

ان میں سے قاعدۂ "استصحاب" خالص شرعی ہے اور باقی تین اصول عقلی ہیں لیکن شرعاً ان کی تائید موجود ہے۔ استصحاب کے بارے میں متعدد احادیث معتبرہ میں سے ایک حدیث ہے "لا تنقض الیقین بالشك" یقین شک سے باطل نہیں ہوتا۔ اصلِ برأت کے لئے متعدد اخبار میں سے ایک حدیث ہے:

"رُفِعَ عن امتی تسعة: ما لا یعلمون، وما لا یطیقون، وما استکرهوا

علیہ وما اضطروا الیہ، والخطاء، والنسیان، والطیرۃ، والحسد، والوسوسۃ فی التفکر فی الخلق"

ترجمہ: میری اُمت سے نو چیزیں اٹھالی گئی ہیں، جو نہیں جانتے، جس کی طاقت نہیں رکھتے، جس پر مجبور کر دیا ہو، جس کے لئے مجبور ہو گئے ہوں، خطا، نسیان، فال، حسد، تخلیق پر فکر میں وسوسہ۔

اس حدیث میں بحثِ مفصل اپنی جگہ ہے، اس موقع پر استدلال "ما لا یعلمون" سے ہے کہ اس سے "اصل برأت ذمہ" ثابت ہوتی ہے یا نہیں؟

اصول اربعہ کا اطلاق کیونکر اور کہاں ہوتا ہے؟ بڑی تفصیل طلب بات ہے ہم ایک سادہ سی مثال شہید مطہری کی کتاب سے نقل کرتے ہیں:

الف: ایک بچے نے زمانہ شیر خواری میں دایہ کے پستان سے کئی مرتبہ دودھ پیا، یہ بچہ جوان ہوا اور اس کی خواہش ہے کہ اس دایہ کی لڑکی سے عقد کرے۔ صورت یہ ہے کہ ہمیں نہیں معلوم کہ اس لڑکے نے دایہ کا دودھ لگاتار پندرہ مرتبہ پیا ہے یا ایک شب و روز یا اس قدر پیا ہے جس سے اس کا گوشت بنا ہو، جیسا کہ منصوص ہے یا یہ شرط پوری نہیں ہوئی؟ اس محل پر "اصل استصحاب" جاری کریں گے۔ کیونکہ اس کے رضاعی ہونے میں شک ہے، اہل استصحاب کا مطلب یہ ہوگا کہ اس صورت حال سے پہلے وہ عورت اس کی رضاعی ماں نہ تھی لہٰذا وہی حالت اب بھی باقی ہے، شک کا اعتبار نہیں۔

ب: وضو کیا، اونگھ آگئی، شک یہ ہے کہ نیند آئی یا نہیں؟ (نیند آئی تو وضو ٹوٹ گیا) اس موقع پر دلیل استصحاب کے ذریعہ شک سے پہلے کی حالت یعنی وضو کا حکم برقرار رکھا جائے گا۔

ج: دوا کی شیشی ہے، شک ہے کہ اس میں الکحل ہے یا نہیں؟ تو اصل برأت ذمہ ہے۔

د: دو شیشیاں رکھی ہیں اور علم اجمالی ہے کہ ان میں سے ایک میں الکحل ہے۔ اصل احتیاط جاری ہوگی اور دونوں کا استعمال نہیں کیا جانا چاہیئے۔

ھ: ایسی جگہ پہنچے جہاں خطرہ ہی خطرہ ہے، سامنے دو راستے ہیں، جہاں موجود ہیں وہاں ٹھہرنے میں جان کا خطرہ آگے بڑھیں تو ایک راستہ محفوظ، دوسرا غیر محفوظ، مگر محفوظ راستہ متعین نہیں، اب کیا حکم ہے؟ ٹھہرنے میں جان کا خطرہ اور حفظ جان واجب ہے، دوسری طرف راستہ میں خطرہ اور جان کو خطرے میں ڈالنا حرام۔ دو معذور ہیں تکلیف شرعی معلوم نہیں، اصل اختیار ہے۔